ڈاکٹر شیراز زیدی

ماہ نامہ ''تہذیب'' میں شامل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ادبی اداریے

معروف محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم ایک ادبی صحافی بھی تھے اور ادبی صحافت سے ان کی دل چسپی علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم کے دور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران جب وہ ایم اے اردو کے طالب علم تھے علی گڑھ میگزین کے چار شمارے اپنی ادارت میں شائع کیے۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں جب وہ بہ حیثیت سیکریٹری اور مدیر اردو لغت بورڈ کراچی سے وابستہ ہوئے تو اپریل ۱۹۷۷ء میں بورڈ کے تحقیقی مجلّے ''اردو نامہ'' کا ۵۴ واں شمارہ بھی ان کی ادارت میں شائع ہوا اور اس میں انھوں نے 'قائدِ اعظم' کے عنوان سے تحریک پاکستان اور قائداعظم کی خدمات پر ایک جامع اور معلوماتی ابتدائیہ لکھا۔ تاہم اس مجلّے کے لیے ان کا یہ ابتدائیہ پہلا اور آخری ثابت ہوا کیوں کہ بعض وجوہ کی بنا پر یہ مجلّہ جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ماہ نامہ مجلّے 'تہذیب' کا اجرا لیث صاحب ہی کی مساعی سے ہوا اور انھوں نے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے اس ادبی مجلّے کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ان کے اداریے یا ابتدائیے ہر ماہ شائع ہونے لگے اور ان کی وفات ستمبر ۱۹۹۴ء تک شائع ہوتے رہے۔

لیث صاحب کے یہ 'ابتدائیے' ایک ادبی شخصیت کے محض تبرکات ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں تحریکِ پاکستان اور تحریکِ سرسید سے متعلق اہم معلومات، تاریخ، سیاست، تہذیب و معاشرت، تعلیم اور علما و زعما کے کردار پر بے لاگ تبصرے، ادب پر تنقید، ادبا و شعرا اور علی گڑھ سے متعلق یادداشتیں موجود ہیں۔ یہ تحریریں تحقیق کے علاوہ ایک بالغ نظر شخص کے مشاہدات کی رو سے معاشرتی قدروں اور روایات کے جائزے میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ مجلّہ چوں کہ سرسید کے 'تہذیب الاخلاق' کی طرز پر نکالا گیا تھا۔ اس لیے اس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل کی اصلاح تھا اور لیث صاحب کے ان 'ابتدائیوں' میں یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہے۔ ان میں لیث صاحب ایک بے باک معاشرتی نقاد کے طور پر سامنے آئے ہیں اور بحیثیت ایک ادیب ان کا وہ اسلوبِ نگارش بھی کھل کر سامنے آیا ہے جس کا بوجھ عام طور پر تحقیقی تحریریں نہیں اٹھا پاتیں۔ یہ ابتدائیے زیادہ تر دو سے تین صفحات پر مبنی ہیں تاہم بسا اوقات سمٹ کر ایک صفحے تک بھی محدود ہو گئے ہیں اور کبھی کوئی ۳-۴ صفحات

تک بھی پھیل گیا ہے۔ اس کی مثال نومبر، دسمبر ۱۹۸۵ء کا شمارہ ہے جس کا ابتدائیہ علامہ اقبال کی فکر اور تعلیمات سے متعلق ہے۔ کبھی ان میں مضمون اور مقالے کی بھرپور سنجیدگی، عملیت ظاہر ہوتی ہے اور بسا اوقات انشائیے کی سی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔

لیث صاحب کے یہ 'ابتدائیے' یا 'ادبی اداریے' ماہ نامہ 'تہذیب' کراچی کی ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۴ء تک کی فائلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ان کی خودنوشت سوانح 'رفت و بود' بھی روز نامہ 'جسارت' کراچی کی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۱ء اور 'تہذیب' کی مارچ ۱۹۸۷ء سے فروری ۱۹۸۵ء کی فائلوں میں دبی ہوئی تھی۔ جسے جامعہ کراچی کی ایک طالبہ نے ۲۰۰۷ء میں ایم اے اردو کے مقالے کے لیے جمع کیا تھا۔(i) اس کے بعد ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ۲۰۱۱ء میں اس خودنوشت کو شائع بھی کر دیا۔(ii) اب بھی ایم اے یا ایم فل کی سطح کے کسی طالبِ علم سے ان 'ابتدائیوں' پر تحقیقی کام کروایا جا سکتا ہے تا کہ یہ ادبی تحریریں ایک نسخے کی صورت میں جمع ہو کر محفوظ ہو جائیں اور ضرورت کے وقت کسی طالب علم کو با آسانی دستیاب ہو سکیں۔ اس کام کا سب سے پہلا حق جامعہ کراچی کا ہے کیوں کہ لیث صاحب نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ جامعہ کراچی کے لیے وقف کیا تھا اور کراچی میں 'تہذیب' کی فائلوں تک رسائی بھی ممکن ہے۔ اگرچہ کسی ایک جگہ مکمل فائلیں تو شاید 'تہذیب' کے دفتر میں بھی نہ مل سکیں مگر اس کے ساتھ جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری، سرسید یونیورسٹی کی لائبریری، غالب لائبریری، ناظم آباد اور بیدل لائبریری، شرف آباد میں چھان بین کی جائے تو ۱۹۹۴ء تک کی مکمل فائلیں دریافت ہو سکتی ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان ابتدائیوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تا کہ ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی جا سکے۔

ماہ نامہ 'تہذیب' کی اولین اشاعت جون ۱۹۸۳ء سے لیث صاحب کے ان ادبی اداریوں کا آغاز ہوا جنھیں وہ ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے تحریر کرتے تھے۔ پہلے ابتدائیے ہی سے انھوں نے تحریک سرسید کی تفسیر اور ترویج و اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا تا کہ نوجوان نسلوں میں اسلامی تہذیب کے تحفظ کا جذبہ اور ملی بصیرت پیدا ہو سکے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ان کے بہت سے 'ابتدائیے' ایسے بھی ہیں جو تحریکِ سرسید کے حوالے سے نصابی مضامین کے درجے میں داخل ہو جاتے ہیں پہلے ہی اداریے کے درج ذیل اقتباس سے اس کے مضمون کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> ''اس وقت جسے یورپ کی جہالت کا دورِ تاریکی کہتے ہیں۔ اسلامی تعلیمی اداروں میں علوم و فنون کی وہ شمعیں روشن تھیں جن سے اکتسابِ فیض کے لیے مسلم اور غیر مسلم، دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہزاروں میل کے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر آتے اور اپنے تہی دامن، علم و فن کے موتیوں سے بھر کر اس نور

کو پھیلانے نکل کھڑے ہوتے، ان کے کتب خانے، ان کے دارالترجمہ اور دارالتصانیف، ان کی رصد گاہیں، اسپتال اور تجربہ گاہیں، اپنی مثال آپ تھیں۔ ان میں سے بعض کے صرف تذکرے باقی رہ گئے اور ان کے نشانات بھی مٹ گئے اور بعض کھنڈرات اور آثارِ قدیمہ آج بھی اس عظمتِ رفتہ کے مرثیہ خواں ہیں۔ قرطبہ اور غرناطہ سے دہلی مرحوم تک اس داستان کے اجزا بکھرے پڑے ہیں۔ سرسید سوچتے تھے کہ ایسا بڑا انقلاب کیوں کر آیا۔ سلطنت گئی تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی علمی، تہذیبی اور تاریخی روایات کو کیسے گھن لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قد آور درخت آندھیوں کی زد میں آ گیا۔''[۱]

سرسید کی تحریک کے ہر پہلو سے اتفاق تو خود ان کے بعض ساتھیوں کو بھی نہیں تھا لیکن اس بات سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ سرسید کے تعلیمی منصوبوں کی بدولت ہی مسلمانانِ برِصغیر سامراجی آقاؤں کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر اپنا حق مانگنے کے قابل ہوئے تھے۔ بے شک پاکستان کے قیام کے لیے سرسید کی دوقومی پالیسیوں ہی نے باقاعدہ بنیاد فراہم کی تھی۔ مسلمانوں کے جداگانہ وجود کا احساس اور اردو زبان کی نثری قوت کا شعور سرسیّد ہی کا مرہونِ منت ہے۔ میٹرک سے بی اے، بی ایس سی کی لازمی اردو تک، نصاب میں لیث صاحب کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔ خاص طور پر سندھ کی نصابی کتب میں، جہاں لیث صاحب کے بعض شاگرد بھی نصاب مرتب کرنے والی کمیٹیوں کے ممبر رہے ہیں، ان کی کسی ایک تحریر کا بھی شاملِ نصاب نہ ہونا از حد حیرت کا موجب ہے۔ ایک ایسے اردو دان کو، جس نے اپنی ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور جس کا شمار بلا مبالغہ اکابرینِ اردو میں ہوتا ہے، یک سر فراموش کر دیا جانا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ مرتبینِ نصاب کو اس بارے میں غور کرنا چاہیے۔ لیث صاحب کے کئی اداریے ایسے ہیں جو مکمل مضمون کا درجہ رکھتے ہیں اور درجہ بندی کر کے انھیں آٹھویں سے بی اے تک کے نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

لیث صاحب کے ان اداریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں سرسید اور ان کی تحریک پر اعتراضات کا ایک سلسلہ پاکستان میں بھی شروع ہوا تھا۔ لیث صاحب نے ان اعتراضات کے جوابات میں جو لکھا ہے وہاں ان کے تنقیدی نظریات بھی سامنے آ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''آپ میں سے اکثر نے یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ ایک صاحب جو تلاشِ معاش میں بہت سرگرداں تھے، سرسید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدد چاہی۔ سرسید نے مشورہ دیا کہ میری مخالفت میں مضمون لکھنا شروع کر دو، اللہ نے چاہا تو روزی کا مسئلہ حل ہو جائے گا، تو سرسید کو بھی تو اب بھی لوگوں نے نہیں بخشا اور ایک سرسید کیا اس قوم نے کس کو بخشا ہے۔ لوگ سیرۃ النبی ﷺ، الفاروق، اورنگ [زیب] عالم گیر اور شعر العجم کے مصنف کا منھ کالا کرنے کی نیت سے ان کی داستانِ

معاشقہ (iii) لکھتے ہیں۔[۲۲]

ایک اقتباس اور دیکھیے:

> ''اقبال کی صد سالہ تقریبات کے جواب میں نتھو درزی سے ان پڑھ فلسفی نور محمد تک'' جیسے مضامین تحقیق اور حقیقت نگاری کا نام دے کر شائع ہوئے۔ اس کے [سے] پہلے اقبال اور عطیہ کے خطوط غالباً اسی تحقیق اور حقیقت نگاری کا سلسلہ تھے (iv) وہی اقبال جن کے نام پر یہ دانش ور آج بھی پل رہے ہیں۔''[۲۳]

درج ذیل اقتباسات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ لیث صاحب مولانا الطاف حسین حالی کی ان تنقیدی روایات کے امین تھے جن میں فن اور مصنف کی صرف خوبیوں پر نظر رہتی ہے اور خامیوں سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے مصنف جنھیں قومی ہیرو کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے ان کی شخصی خامیوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ احترامِ اسلاف کا یہ رویہ لیث صاحب کی تنقید میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایسے مقامات پر جہاں احترام اسلاف کے جذبے کو ٹھیس پہنچتی ہے ان کا لہجہ بھی خاصا سخت ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی تنقیدی تاثراتی ہے۔ نومبر ۱۹۷۸ء میں سید محمد ہادی صاحب کی کتاب ''علی برادران اور ان کا زمانہ'' مکتبہ جامعہ ملیہ لمیٹڈ دہلی سے شائع ہوئی جس کا تعارف عبدالغنی ڈار نے لکھا۔ اس کتاب پر لیث صاحب نے تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک اقتباس اور دیکھتے چلیے:

> ''تعارف نگار مصنف کے بارے میں حسنِ ظن کا شکار ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں، لیکن حق گوئی اور حقیقت پسندی کو ایمان بالغیب کا درجہ دینا تعارف یا تبصرہ کی نفی کر دیتا ہے۔۔۔ اگر حقیقی تصویر اور حقیقت نگاری کا مقصد تاریخی حقائق کی تلبیس اور ان کو اپنی پسند ناپسند، اپنے مسلک سے اتفاق یا اختلاف یا ضرورتِ وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لینا ہے، تو پھر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس کتاب میں جیسا کہ آگے چل کر ہم عرض کریں گے، یہی مقصد اس 'حقیقی تصویر نگاری' کا ہے۔ یہ صرف وہ انداز ہے جسے آج کی اصطلاح میں 'کردار کشی' کہتے ہیں۔''[۲۴]

دراصل لیث صاحب آزادیٔ قلم کی بھی حدود مقرر کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں قلم کی آزادی کا مطلب اسلاف کا تمسخر اڑانا نہیں ہے۔ ایک جگہ انھوں نے آزادیٔ قلم کے اس مفہوم پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اب ہر شخص کا دعوا ہے کہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتا ہے اور جو چاہے کہ دے کوئی اس کے منہ میں لگام نہیں دیتا، نہ دے سکتا ہے اور ہر شخص کا یہ دعوا ہے کہ قلم اس کے ہاتھ میں ہے اور اس سے وہ جو چاہے لکھ دے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں، بونے قد والے جنات جیسے قد آور شخصیتوں کے کارناموں پر اس لیے پردے ڈال رہے ہیں کہ ان کی چھوٹی شخصیتوں کا قد بڑا نظر آنے لگے اور اس کے لیے وہ

چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کا سہارا لیتے ہیں۔‘‘ ۵

درج بالا اقتباسات ۲ تا ۴، ان کے فروری ۱۹۸۵ء کے ابتدائیے سے لیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض اداریے تنقیدی مضامین کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کا اندازِ تنقید تاثراتی ہوتے ہوئے نظریاتی بھی ہے، یعنی انھوں نے ادب کو اول ایک مسلمان اور پھر پاکستانی ناقد کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اسلاف کے اندازِ تنقید کی اس روش سے بھی جدید ادب کے طلبا کا واقف ہونا ضروری ہے۔

لیث صاحب نے اپنے ان اداریوں میں ادبا پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ اس کی مثال کے لیے جولائی ۱۹۸۴ع کا اداریہ دیکھا جا سکتا ہے جو مولانا حسرت موہانی پر ہے۔ تین صفحات کے اس مختصر سے مضمون میں انھوں نے حسرت کی زندگی کا بہترین خاکہ کھینچا ہے۔ مذکورہ اداریے سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

> ’’۱۹۰۳ء میں مولانا نے اسی رسالے [اردوئے معلا] میں ایک مضمون چھاپا جس میں مصر کے مشہور لیڈر مصطفا کامل [کذا: کمال] کی موت پہ اظہارِ خیال کیا گیا اور انگریزوں کی مسلم کش پالیسی پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ مضمون مولانا نے نہیں لکھا تھا اور مولانا نے مضمون نگار کا نام بھی شائع نہیں کیا۔ اس مضمون کو باغیانہ قرار دیا گیا۔ مولانا نے مضمون نگار کا نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا (v) اور خود دو سال کی قید بامشقت گوارا کر لی۔۔۔ اسی قید میں مولانا کا مسکن ایک چھ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی کوٹھڑی تھی۔ آج کل کے سیاسی رہنماؤں کے بنگلوں میں ان کے غسل خانے بھی اس سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں اور اس میں مولانا کے بدن پر ایک کرتی اور ایک جانگیہ اور اس کی مولانا کو پرواہ نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ نماز کے لیے اس سے پوری ستر پوشی بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا وہی بستر وہی جانماز اور ایک ڈبہ وہی پانی پینے، آب دست، وضو کرنے کے لیے عطا ہوا تھا اور اس عالم میں مولانا نے ماہِ رمضان گزارا‘‘ ۶

ایک اور مثال جنوری ۱۹۸۵ء کے اداریے کی ہے، جو مولانا محمد علی جوہر سے متعلق ہے۔ اس کا مضمون بھی تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے:

> ’’یہ شعر ہمیں اس مہینے میں مولانا محمد علی جوہر کی یاد دلاتا ہے، جنھوں نے اس مہینے میں وفات پائی۔ جیسا کہ ناظرین کے علم میں ہے، وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اسٹریچر پر ڈال کر جہاز پر پہنچائے گئے تھے اور وہاں انھوں نے تاریخی تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر آپ میرے ہات میں میرے ملک کی آزادی کا پروانہ نہیں دیں گے تو آپ کو اپنے یہاں مجھے قبر کے لیے دو گز زمین دینا پڑے گی اور انھوں نے جو کہا تھا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ وہ اسی طرح ہو۔ انھیں برطانیہ میں پیغام آیا لیکن ان کا مدفن بیت المقدس کی وہ سرزمین ہے جو پیغمبروں اور انبیائے کرام کا مدفن ہے۔‘‘ ۷

نومبر دسمبر ۱۹۸۵ء کے اداریے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو علامہ اقبال سے متعلق ہے اور ۳۲ صفحات کے ایک مقالے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ غرض کہ ان اداریوں میں کئی ادبی شخصیات پر مضامین اور ان سے متعلق اہم معلومات درج ہیں، جو ادب کے طالب علم کے لیے معاون ہو سکتی ہیں۔ انھیں بالکل ہی غیر اہم جان کر، برباد ہونے کے لیے، رسالے کی فائلوں میں دبا، رہنے دیا جانا اور ضائع کر دینا درست نہیں ہے۔

ان اداریوں میں لیث صاحب ایک معاشرتی نقاد کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کی اس نسل سے تھا جس نے تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ہجرت کا کرب سہا تھا اور نہ جانے کیسی کیسی آرزوئیں لیے اس خوابوں کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ اسی سرزمین پر ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو جائے گا جو لسانی تعصب میں مبتلا ہو کر 'اردو' پر دشنام طرازی کرتے وقت یہ حقیقت بھی فراموش کر دے گا کہ یہ وہی زبان ہے جسے ہندوستان کے مسلمانوں نے بالاتفاق اپنی قومی زبان تسلیم کیا تھا اور اسی لیے قائداعظم نے واضح طور پر فرما دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہو گی۔ پاکستان کے دستور میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے بھی ایک مدت مقرر کی گئی تھی مگر قائداعظم کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ لیث صاحب خود بھی پاکستان بننے سے قبل علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے اس وقت ''اردو'' کی بقا کی قلمی جنگ لڑتے رہے تھے، جب گاندھی جی نے اردو کو قرآنی حروف میں لکھی ہوئی مسلمانوں کی زبان قرار دیا تھا اور ہندو شدت پسندوں نے اردو زبان کے خلاف محاذ بنا لیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اردو سے بغض کی وجہ سے 'اردو بولنے والوں' کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ یہ پاکستان کی اس نظریاتی سرزمین پر وجود میں آنے والے وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا اور جنھیں جان کر آج کی نوجوان نسل با آسانی اس بات کا اندازہ لگا سکتی ہے کہ آخر وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو پاکستان کی سرزمین پر پاکستانیوں کی اپنی زبان ''اردو'' کے حقیقی نفاذ کی راہ میں مزاحم رہی ہیں۔ لیث صاحب نے ستمبر ۸۹ء کے اداریے میں بڑے دکھ سے اس کا اظہار کیا ہے:

> ''چند دنوں سے اردو بولنے والوں کو طرح طرح کے خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو جیب کترے، دلال اور بدمعاش تھے اور ان کی عورتیں جو چست پاجامے اور غرارے پہنتی ہیں رنڈیاں تھیں جن کو کبوتریاں کہتے تھے۔ سبحان اللہ ہم بھی کن کن خطابات کے مستحق ٹھہرے، چلیے مجبوری و بے چارگی لیکن اردو زبان کے بارے میں، اس کی اصل اور ارتقا کے بارے میں وہ لوگ بھی خامہ فرسائی کر رہے ہیں جو اپنی جہالت سے روزی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔''[۸]

اس کے ساتھ ایک ایسا صاحبِ اختیار طبقہ بھی بدستور موجود تھا اور ہے جو اردو زبان کا استحصال صرف اور صرف اس لیے کر رہا ہے تاکہ انگریزوں کی زبان اور ان کے رنگ ڈھنگ اپنا کر عوام پر اپنی فوقیت قائم رکھ سکے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زبان تہذیب کی ترجمان ہوتی ہے۔ انگریزی بہروپ اس وقت تک کارگر نہیں ہوسکتا جب تک اسے بھرنے والا انگریزی زبان کی دھاک نہ بٹھا دے۔ لیث صاحب امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے بھی ہیں اور پڑھایا بھی ہے۔ وہ انگریزی تقریر و تحریر پر اچھی خاصی قدرت رکھتے تھے مگر وہ اس طبقے کے کڑے نقاد تھے جو انگریزی کو اردو زبان اور مشرقی تمدن کی حقارت کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''انگریزی ہماری سر آنکھوں پر، ہمارے سابق آقاؤں کی زبان ہے جو ہمیں چھوڑ گئے، ہم ان کے قدیم نمک خوار ہیں اور ہمارا ہی ایک طبقہ ان کے مفادات کی نگرانی کے لیے اپنی اولاد کو ان ہی کے رنگ ڈھنگ میں ڈھال کر اس معاشرے کے ایک ممتاز اور حاکم طبقہ میں رہنا چاہتا ہے اور انگریزوں کی جگہ وہ ان کا خلیفہ بن کر حکومت کرنا چاہتا ہے۔''[9]

لیث صاحب کے ان اداریوں میں ایسے زعما، علما اور صاحبانِ اختیار پر بھی تنقید موجود ہے جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بے لوث کام کرنے کی بجائے صرف اپنی تشہیر چاہتے ہیں۔ جب تک شہرت، دولت، انعامات، صلے، مراعات اور عہدوں کی ہوس کو بالائے طاق نہ رکھ دیا جائے اس وقت تک قومی ترقی کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ قوم کو عروج پر لے جانے کے لیے رہنماؤں کو اپنی ہستی مٹانی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے وطنِ عزیز پر شروع ہی سے اکثر ایسے افراد کی اجارہ داری رہی ہے جنھیں قومی بھلائی سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، ان میں بلا تخصیص علما بھی شامل ہیں اور زعماً بھی، لیث صاحب نے لکھا ہے کہ: ''ہمارے ایسے عالم لیڈر ہیں جو سرکاری خرچ پر پانچ ستاروں والے ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں اور عوام کی نمائندگی کے دعوے دار ہیں۔ جب بستیاں اجڑ جاتی ہیں اور آباد علاقے ویران ہو جاتے ہیں تو یہ فوٹو گرافروں کے ساتھ بستیوں کے مکینوں کی دل دہی کے لیے تشریف لے جاتے ہیں۔''[10] لیث صاحب کے اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وقت تو بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے لیکن مملکتِ اسلامی کے صاحبانِ اختیار کے رویوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور ایوانوں کی منافقت میں مدرسے بھی شروع ہی سے برابر کے شریک رہے ہیں۔ لیث صاحب نے لکھا ہے:

> ''صاحبانِ عالی شان اور حاکمانِ والاشان جو چاہیں کریں کم از کم اسلام کو آڑ بنا کر اپنے اعمال پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ کیا ان کے خیال میں علما کی ایک دو کانفرنسیں بلا کر کوئی اسلامی انقلاب

آسکتا ہے۔اس کے لیے احتساب ضروری ہے۔حاکموں اور محکوموں، طاقت وروں اور کم زوروں، صاحبانِ اختیار اور مجبوروں، دولت مندوں اور غریبوں سب کے احتساب کے بغیر صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔''[۱۱]

صاحبانِ اختیار کے ایسے رویوں کا نتیجہ اخلاقی زوال کی صورت ہی میں ظاہر ہونا تھا۔ چنانچہ عوام چوروں، ڈاکوؤں کے ہاتھوں یرغمال بن گئے۔زندگی کی بڑھتی ہوئی ضروریات، معاشی انحطاط، بے روزگاری، عدم تحفظ کا احساس منشیات کے استعمال میں فروغ کا باعث ثابت ہوئے۔بڑے بڑے ناموں والے عوام کے ان دکھوں کا چارہ تو نہ کر سکے البتہ ان کی زبوں حالی کا علاج کرنے کے لیے خود منشیات فروشی کے سود مند کاروبار سے منسلک ہو گئے۔لہٰذا یہ نظریاتی طور پر وجود میں آنے والی اسلامی مملکت، اس تباہ شدہ دہلی کا نقشہ پیش کرنے لگی جہاں نہ کسی کی دستار محفوظ تھی اور نہ سر۔لیث صاحب نے اس اخلاقی زوال کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> ''اخلاقی معیار گرتا جا رہا ہے۔بل کہ یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ بھی عنقا ہے۔منشیات کا رواج عام ہے اور اس کا کاروبار سب سے زیادہ نفع کا کاروبار ہے اور اس میں بڑے بڑے 'پردہ نشینوں' کے نام شامل ہیں۔چوری ڈکیتی کا حال دیکھ کر سوؔدا کا وہ قصیدہ یاد آتا ہے جس میں دہلی کے کوتوال شہر کا حال بیان ہوا ہے کہ چور بیچ چورا ہے پر اس کے سر سے پگڑی اتار کر اسی سے پوچھتا ہے کہ میاں اس کے کیا دام دو گے (vi) نہ کسی کی عزت سلامت ہے اور نہ عصمت محفوظ، اپنی پگڑی سنبھالنا دشوار ہے، اسی زمانہ میں میر کو نصیحت کی گئی تھی کہ:
>
> ؎ پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے
>
> اور اب ہمارا ہر گلی کوچہ میرؔ کے زمانے کی دلی سے بڑھ کر ہے۔''[۱۲]

اس کے ساتھ ہی بے عملی اور کاہلی بھی پنپنے لگی اور بقول لیث صاحب یہ: ''یہ ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے کہ ہم کام کم کرتے ہیں اوروں کے کام پر اعتراض زیادہ کرتے ہیں۔کیوں کہ اعتراض کرنا آسان ہے اور جب اعتراض کرنے والا خود کوئی کام ہی نہیں کرے گا تو پھر اعتراض کس چیز پر ہوگا۔''[۱۳] ایسے ہی ادوار، جب ہر آدمی کو صرف دوسرے ہی کے گریبان میں جھانکنے کی عادت پڑ جائے، ہجوں کے لیے بھی موثر ہوتے ہیں۔ لیث صاحب نے جن معاشرتی مسائل پر قلم اُٹھایا ہے یہ ترقی پسندوں کے ہاں عام پائے جاتے ہیں۔لیث صاحب ترقی پسند نہیں ہیں بلکہ ترقی پسند تحریک کے اچھے خاصے مخالفین میں سے تھے۔البتہ ترقی پسند تحریک سے الگ انھوں نے ترقی پسندی کا ایک اور معیار قائم کر رکھا تھا جو تحریکِ سرسید کا تسلسل تھا۔تحریکِ سرسید میں اگر پاکستانی قومیت کا شدید احساس بھی پیدا کر دیا جائے تو لیث صاحب کی تنقیدی فکر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ان کی تنقید کا یہ انداز اردو ادب میں نامانوس ہے۔اردو ادب کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔خود لیث صاحب نے

بھی ایک ادبی تاریخ لکھی ہے(vii) مگر اب ادبی تاریخ نگاری صرف اور صرف شاعروں ادیبوں کی ولادت و وفات اور ان کی تخلیقات کی تواریخ کی تحقیق تک ہی محدود نہیں رہی، کیوں کہ ایسا ہو تو چند دستیاب حقائق کے بعد ادبی تاریخ نگاری کے امکانات محدود ہو جائیں گے۔ اس لیے اب ادبی محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو اپنے نکتہ نظر (vision) کے مطابق مرتب کرے اور ایسی تاریخ نگاری میں ایک ادیب اور محقق کے معاشرتی تجربات اور تجزیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر قیام پاکستان کے بعد سے جب ادبی تاریخ نگاری کا آغاز ہوگا تو لیث صاحب کے یہ ادبی اداریے ایک ادبی محقق کے لیے اچھے خاصے معاون ثابت ہوں گے۔

لیث صاحب کے ان ابتدائیوں میں کئی اہم یادداشتیں بھی موجود ہیں۔ اکثر علی گڑھ اور علی گڑھ کی بڑی بڑی شخصیات سے متعلق ہیں اور ان میں ایسے واقعات درج ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر اپریل ۱۹۸۹ء کے ابتدائیے میں انھوں نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین کا ذکر کیا ہے اور ان کی وائس چانسلری کے دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے دور میں علی گڑھ میگزین میں ایک نظم شائع ہوئی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا کہ 'پھر کسی غزنی سے کوئی غزنوی پیدا کرو' گاندھی جی اس زمانے میں نئی دہلی میں کسی آشرم میں پراتھنا میں مصروف تھے۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ علی گڑھ والے پھر کسی غزنوی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے رہے ہیں۔ گاندھی جی کے اس تبصرے سے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وائسرائے نے گورنر، گورنر نے کمشنر اور کمشنر نے کلکٹر کو خبر دی۔ شاعر کے ایک مصرعے سے ایوانوں میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو رسالہ واپس لینے کی ہدایات کی گئیں، چنانچہ انھوں نے حکم دیا مگر طلبا اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف مظاہرے کیے۔ ان کے ساتھ اچھی خاصی بدتمیزی کی اور استعفا لے کر ہی دم لیا۔[۱۴] علی گڑھ کے پوسٹ مینوں اور ٹھیلے والوں کا ذکر بھی ان ابتدائیوں میں ملتا ہے۔ جون/۱۹۹۲ء کے ابتدائیے سے، جسے انھوں نے مضمون کی نسبت سے 'کیسے کیسے لوگ' کا عنوان دیا ہے۔ درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> ''مجھے منشی عبدالخالق کا چہرہ یاد آرہا ہے۔ پوسٹ مین تھے۔۔۔۔ عبدالخالق کو پتہ رہتا کہ کس کا منی آرڈر ابھی نہیں آیا۔ کوئی بات نہیں، عبدالخالق خدمت کے لیے حاضر تھے۔ روپیہ تو خیر واپس مل ہی جاتا، تعطیلات میں عبدالخالق ایک طویل سفر کا پروگرام بناتے، طالب علموں کے گھر پہنچتے، ان کو اور والدین کو پاس ہونے کی مبارک باد اور فیل ہونے والوں کو تسلی دیتے، مہمان رہتے، آگے سال دوبارہ علی گڑھ آنے کی دعوت دیتے، مہمانی اور انعام سے خوش واپس آتے اور یہ دوسرا چہرہ۔ یہ میاں ممتاز ہیں جو فیرنی بیچنے ہاسٹل میں آتے، ان کے یہاں فیرنی کے مدارج، انٹر، بی اے اور ایم اے

تھے۔اسی طرح کہتے اور اسی طرح بیچتے۔نقد یا ادھار دونوں برابر، کچھ دنوں صبح کے ناشتے کے لیے پراٹھے بھی پکوالیتے اور یہ کون، یہ میاں کھمانی۔ان کا ذکر رشید صاحب نے بھی کیا ہے۔ہم نے جب دیکھا، آفتاب ہاسٹل کی بغل میں انجینئرنگ آفس تھا۔اس کے برآمدے میں پان سگرٹ رکھے رہتے۔خریدنے والے خریدتے ورنہ یوں ہی دو چار بولیوں ٹھولیوں کے لیے ٹھہر جاتے۔برابر میں پروفیسر کا دفتر تھا۔عبادت الرحمان خان مرحوم، قد آور شخصیت بڑے آن بان والے تھے۔وہ بھی گزرتے تو کھمانی سے دعا سلام ہوتی، کھمانی، اپنی عینک، جو ایک کمانی سے محروم ان کے کان پر لٹکتی، ناک پر نیچے لاکر، خان صاحب کو دیکھتے، خوش ہو جاتے اور دعائیں دیتے۔''۱۵

لیث صاحب ماہر تعلیم بھی تھے۔اس میدان میں ان کا تجربہ خاص وسیع تھا۔انھوں نے نظام تعلیم کو بہتر بنائے جانے کے لیے مختلف اوقات میں بنائی گئی پالیسویوں پر بھی اپنی ماہرانہ آرا بے باک قلم بند کیں۔جو تہذیب کے مختلف ابتدائیوں میں موجود ہیں۔وہ جانتے تھے کہ تعلیم محض نصابی کتب رٹنے ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے طالب علم کو ایک تربیتی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ابتدا اوّل گھر سے ہوتی ہے۔۱۹۸۸ میں حکومت نے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنانے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے کچھ سفارشات پیش کیں۔لیث صاحب نے اکتوبر ۱۹۸۸ء کے ابتدائیے میں حکومت کے اس تعلیمی منصوبے پر رائے دیتے ہوئے لکھا:

> ''تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام محض نصاب میں یا درسی کتابوں میں اسلام کا نام، مسلمانوں کی تاریخ کے چند واقعات کے بیان اور اسلامی اخلاقی اقدار کے ذکر سے حاصل ہو جاتا تو بات بہت آسان ہو جاتی۔یہ مطلب تو صرف معاشرے میں اسلامی انقلاب سے حاصل ہو سکتا ہے۔بچہ اگر کسی کتاب میں پڑھتا ہے کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے لیکن گھر پر کوئی آواز دے تو ابا جان فرماتے ہیں کہ دو کہ ابا گھر پر نہیں اور بچہ اس پر عمل کرتا ہے۔غرض بچہ جو کچھ کتابوں میں پڑھتا ہے اسے صرف ایک کتابی بات سمجھتا ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔بچے کو اپنے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے وہ ایک حقیقت ہوتی ہے۔''۱۶

ان ابتدائیوں میں مادری زبان کے نظامِ تعلیم ہونے، اردو کے نفاذ کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات اور اردو رسم الخط سے متعلق سنجیدہ علمی بھی مباحث شامل ہیں۔لیث صاحب

کے کئی ابتدائیے انشائیے کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنھیں کوئی عنوان دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'مسئلہ کیا ہے؟'، 'قدر دانی عالمِ بالا معلوم شد'، 'ہٹ یارٹ'، 'گھوڑے اور گدھے'، 'گدھوں کی تعداد میں اضافہ'، 'کچھ عطائی طبیبوں کے بارے میں' اور 'ادبی خرکار'، وغیرہ۔ ایک جگہ موضوع کی مناسبت سے سوالیہ علامت '؟' کی تکرار کو بھی عنوان بنایا ہے۔ لیث صاحب نے ایسے ابتدائیوں میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ مثلاً جون ۱۹۸۹ء کے ابتدائیے میں انھوں نے انگریزی نظامِ تعلیم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ابتدائیے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> ''خدا بخشے اکبر الٰہ آبادی بڑے مزے دار آدمی تھے۔ شاید الٰہ آباد کے امرودوں سے کچھ زیادہ ہی شہرت رکھتے تھے۔ اب الٰہ آباد میں کوئی اکبر نہیں۔ سنا ہے امرودوں کی بھی وہ نسل ختم ہوگئی۔'' ۱۸

اکبر الٰہ آبادی کے ذکر سے بات ان کی علامتی شاعری تک پہنچتی ہے، ان کے 'اونٹ' کے استعارے کا ذکر ہوتا ہے اور اونٹ کا ذکر لیث صاحب کے ذہن کو ان کے آبائی شہر بدایوں کے آس پڑوس کے دیہاتوں میں سفر کے لیے استعمال کی جانے والی اونٹ گاڑی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہ اونٹ گاڑی دو منزلہ بنائی جاتی تھی ایک منزل میں سوار اور دوسری میں سواریاں۔ سفر اکثر رات ہی کو ہوتا۔ مسافر اونٹ کی مہار منزل کی طرف موڑ دیتے اور خود سو جاتے، بے چارہ اونٹ اسی سمت چلتا رہتا اور وقت پر منزل پر پہنچ جاتا مگر ایک بار یوں ہوا کہ گاڑی روانہ ہوئی تو کسی ظالم نے آدھی رات کے وقت، جب آدھا فاصلہ طے ہو چکا تھا، اونٹ کی مہار اسی سمت پلٹ دی جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اونٹ بے چارہ اسی سمت چلنے لگا۔ صبح جب مرغِ سحر نے اذان دی اور مسافر بے دار ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہیں تھے جہاں سے چلے تھے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہ قصہ ہمیں یوں یاد آیا کہ طویل مدت سے ہمارے ماہرینِ تعلیم کے نزدیک ہماری تعلیمی پسماندگی کا سب سے بڑا سبب ہمارے نظامِ تعلیم پر انگریزی کا غلبہ ہے اور جب تک ہم اپنی تعلیم کی منصوبہ بندی میں اپنی زبان کو وہ مقام نہیں دیں گے جس کی وہ مستحق ہے ترقی کی کوششیں بے سود ہیں۔ کچھ دستوری شق کے حوالے سے اور کچھ مجبوریوں سے ہم بادلِ ناخواستہ اردو کی ترقی کا نام لینے لگے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے یہ فیصلہ بھی ہوا کہ ایک مدتِ معینہ کے بعد میٹرک تک ذریعہ تعلیم صرف اپنی زبان ہوگی لیکن تازہ ترین حکم یہ ہے کہ انگریزی کو لازمی طور پر پہلی جماعت سے پڑھایا جائے اور بجائے 'رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے تیری گائے بنائی' Baba black sheep سے تعلیم کا آغاز ہو، ٹھیک ہے، بھیڑ کا مزاج پیدا کرنے کے لیے Sheep ہی مناسب علامت ہے۔۔ الخ'' ۱۹

لیث صاحب، رشید احمد صدیقی ایسے طنز و مزاح نگار کے شاگرد تھے اور اس شاگردی پر انھیں فخر بھی تھا۔ اگر لیث صاحب کی پوری توجہ تحقیق اور لسانیات کی طرف نہ ہوتی تو ان کے اندر بھی ایک بڑا طنز و مزاح نگار

چھپا ہوا تھا اور وہ اس میدان میں خاصا نام کما سکتے تھے۔ سوانح کے علاوہ ان کے صرف یہی ادبی اداریے ہیں جہاں ان کی تخلیقی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان کے کئی انشائیہ نما ابتدائیے فکاہی ادب ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں طنز کی شدت بھی نمایاں ہوتی ہے مگر ابتذال کی کیفیت کہیں پیدا نہیں ہوتی اور زیرِلب تبسم بھی پیدا ہوتا ہے۔ درج ذیل اقتباسات دیکھیے۔

''سو قصہ یہ ایک عالم یا سخن داں کا ہے جس نے ساری عمر خونِ جگر کو کاغذ پر منتقل کیا لیکن اسے کوئی قدر دان نہ ملا، بے چارے نے مایوس ہو کر آسمان کی طرف دیکھا اوپر سے کوئی چیل (آپ شہباز سمجھ لیں) اڑتی ہوئی گزری اور اس نے جو بیٹ کی وہ بے چارے کی پیشانی پر تمغہ بن کر گری۔ کہنے لگا قدر دانیِ عالمِ بالا معلوم شد۔'' ۲۰

''اصل خرکاری ادبی میدان میں ایک اور رنگ میں تھی۔ مجھے ابھی تک اپنے بچپن کا ایک منظر یاد ہے۔ یہ ہندوستان کا ایک بڑا شہر تھا۔ اس کے ایک بڑے بازار میں پھلوں اور مٹھائیوں کی بہت سی دکانیں تھیں، ویسے اسی سے ذرا آگے بڑھ کر طوائفوں کی بستی تھی۔ یہاں ایک دکان پر ایک بڑا بورڈ لکھا تھا۔ پوری عبارت یاد نہیں کچھ اس قسم کی تھی۔ غزل درجہ اول، ایک روپیہ فی شعر، غزل درجہ دوم، آٹھ آنہ فی شعر، غزل درجہ سوم، چار آنہ فی شعر، قصیدہ درجہ اول، دس روپیہ فی قصیدہ، قصیدہ درجہ دوم، پانچ روپیہ فی قصیدہ، اصلاح فی غزل دس شعر تک، پانچ روپیہ وغیرہ وغیرہ۔ دکان خوب چلتی تھی۔ اب اس کی شاخیں ہندوستان، پاکستان دونوں جگہ ہیں، نام بدل گئے ہیں۔'' ۲۱

طنز و مزاح پیدا کرنے کے لیے مصنف کئی طرح کے اہتمام کرتے ہیں۔ بسا اوقات جملے کے ذریعے طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کے لیے کوئی واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی لفظوں کے تغیر و تبدل سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ لیث صاحب کے ابتدائیوں میں تینوں کیفیات موجود ہیں۔ درج ذیل اقتباسات اور دیکھتے چلیے:

''پاکستان کی دولت سے کتنے حرام زادے، نواب زادے بن گئے اور یہ نواب یہاں آ کر فقیر زادہ بن گیا۔'' ۲۲

''یہ ہمارے دوسرے دوست ہیں۔ ان کا مسئلہ کیا ہے؟ صاحب سر پر چھت نہیں، تنخواہ کا آدھے سے زیادہ کرایہ کی نظر ہو جاتا ہے۔ لگژری فلیٹ اور بنگلوں کے خوب صورت اشتہار پڑھتے ہیں، قیمت آپ کے تصور سے کم (علاوہ قرضہ) اور یہ قرضہ اتارتے اتارتے خریدنے یا بنانے والا خود کسی گورستان میں مفت دائمی مکان کی امید میں دفن ہوتا ہے۔ چند روز بعد گورکن اسی قبر کو دوسرے آنے والے کے لیے تیار کر رکھتے ہیں۔ کیا کریں جائے تنگ است و مرداں بسیار، یہاں زندوں کے رہنے کو ٹھکانہ نصیب نہیں آپ مردوں کی بات کرتے ہو۔'' ۲۳

''سنا اور پڑھا تھا کہ 'ہٹ' کی تین قسمیں ہوتی ہیں، راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ ۔۔۔ اور ایک چیز رٹ ہوتی ہے۔''[۲۴]

''گدھا دوڑ صرف کراچی میں ہوتی ہے اور بلا شبہ ہم نے یونیورسٹی روڈ پر گدھوں کی دوڑ دیکھی ہے۔ کیا کہنا خوب دوڑتے ہیں لیکن محض دوڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ گھوڑے تو بن نہیں جاتے رہتے گدھے ہی ہیں۔ یوں ہمارے بہت سے گھوڑوں میں بھی گدھوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اسی لیے ان کو استعارہ میں گدھا کہتے ہیں۔''[۲۵]

آخری اقتباس لیث صاحب کے ابتدیئے 'گدھوں کی تعداد میں اضافہ'' سے لیا گیا ہے جو ان کی وفات سے دو ماہ پیش تر جولائی ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے ان ابتدائیوں میں اپنی ذاتی زندگی کے بعض احوال بھی نقل کیے ہیں۔ ہم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو پی ایچ ڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں جنھیں ان کے مقالے ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' پر علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی مگر ایک ابتدائیے میں جس کا عنوان '' کچھ عطائی طبیبوں کے باب میں'' ہے۔ لیث صاحب نے اپنی زندگی کی ایک ایسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف تو میٹرک کرتے ہی ڈاکٹر بن چکے تھے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''یادش بخیر ۱۹۳۲ء میں جب ہم نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے تو ہمارے ایک عزیز نے جو تھے تو ایک سرکاری ملازم لیکن مشغلے کے طور پر ہومیو پیتھک دواؤں کا ایک بکس بھی رکھتے تھے، سو انھوں نے مشورہ دیا کہ بھئی ہماری رائے میں تو تم بھی ڈاکٹری شروع کر دو، والدہ تمہاری ڈاکٹر تھیں، بڑے بھائی آگرہ میڈیکل اسکول سے اپنی پڑھائی نامکمل چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ میں آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ کلکتہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہنیمن کالج ہے، اس کو بیس روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دو، وہ ایک سند، ایک کتاب اور ایک ڈبہ مع دواؤں کا بھیج دے گا، بورڈ لکھوا کر گھر کے دروازے پر لکھوانے کی دیر ہے۔ بس سمجھو ڈاکٹر ہو گئے۔ سو شوق میں ہم بھی راضی ہو گئے اور بیس روپیہ بھیج کر، وہ سند، کتاب اور ڈبہ منگوایا اور پھر یوں ہوا کہ بدایوں میں ہیضہ پھیلا اور ہم خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ان بستیوں کا چکر لگانے لگے۔''[۲۶]

لیث صاحب نے اپنے ان فکاہی ابتدائیوں میں جو اسلوب نگارش اپنایا ہے اس سے زیادہ تر زیرِ لب تبسم ہی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے ساختہ قہقہہ نکل جاتا ہے۔ اس کی مثال ان کا جولائی ۱۹۹۰ء کا ابتدائیہ ہے جس کا عنوان بھی اچھوتا ہے۔ انھوں نے مضمون کی مناسبت سے ''؟؟؟؟؟؟ ۔۔۔۔'' سوالیہ علامت کی تکرار کو اس کا عنوان قرار دیا ہے۔ علی گڑھ میں ہر طالب علم کو اعزازی

طور پر کوئی نہ کوئی عرفیت مرحمت فرمادی جاتی تھی۔ اس ابتدائیے میں انھوں نے کسی مسعود صاحب کا ذکر کیا ہے جنھیں 'ٹامی' کا خطاب عطا فرمایا گیا تھا۔ آخر میں اس تحریر سے بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے ۔ یہ لیث صاحب کی ظرافت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے اور اس سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ لیث صاحب اگر مزاح نگاری کی طرف توجہ دیتے تو ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہوتے:

> ''مسعود ٹامی نے ملازمت کے لیے درخواست دی۔ جن کے سامنے یہ درخواست پیش ہوئی، وہ زبان اور املا کے معاملے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حساس تھے۔ مشہور ہے کہ ان کے صاحب زادے نے گھر کے رواجِ مقررہ کے مطابق والد صاحب قبلہ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی مجھے ایک بائسیکل کی ضرورت ہے۔ قبلہ نے اس پر حکم صادر فرمایا 'درخواست نامنظور، سائیکل کو دو چرخی کہتے ہیں'۔ مسعود ٹامی نے اپنی درخواست میں شوشوں اور نقطوں کے لگانے میں ذرا احتیاط کم کی تھی۔ 'درخواست نامنظور، نقطوں کو برمحل نہیں لگایا گیا'۔ مسعود ٹامی کی شوخیِ گفتار، رفتار اور تحریر دیکھیے کہ اب جو تحریر لکھی تو اس میں ایک بھی نقطہ نہیں لگایا۔ البتہ آخر میں کئی سطروں میں صرف نقطے لگا دیے۔ 'عرض ہے کہ حسبِ ضرورت اس ذخیرہ میں سے نقطے لے لیجیے'۔'' [۲۷]

ستمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں لیث صاحب کا آخری اداریہ شائع ہوا۔ اسی ماہ کی ۷ تاریخ کو ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی تحریروں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیث صاحب بلاشبہ اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت تھے۔ ان کی کتابیں اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ سوائے ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے ان کی کوئی کتاب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ ان کی تخلیقی تحریروں میں ان کی سوانح 'رفت و بود' کے علاوہ یہ ادبی اداریے ہی تبرک کے طور پر موجود ہیں جو ''تہذیب'' کی پرانی فائلوں میں بند پڑے ضائع ہو رہے ہیں۔ یہ اداریے تحقیق کے کئی پہلوؤں جیسے کہ مزاح نگاری کی تاریخ و اسلوب، نظامِ تعلیم کی اصلاحات، تنقیدی رجحانات، نفاذِ اردو کی تحریکیں، اردو رسم الخط کے مباحث، علی گڑھ تحریک، پاکستانی ادب کا پس منظر، بعض بڑی ادبی شخصیات کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی وغیرہ میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیث صاحب کی سوانح کو ایک عرصہ بعد کتابی صورت میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہاں ان ادبی اداریوں کا یہ اجمالی جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کسی محقق کو تحریک و تشویق ہو اور وہ ان تحریروں پر کام کر کے انھیں محفوظ کر لے۔ اس طرح اگر یہ کتابی صورت میں شائع نہ بھی ہو سکے تو کم از کم کسی یونیورسٹی میں مقالے کی صورت میں ضرور محفوظ ہو جائیں گے اور بوقتِ ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکے گا۔

حواشی

۱۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، (ابتدائیہ) ماہ نامہ ''تہذیب'' کراچی، ج ۱ ش ۱، جون ۱۹۸۳ء، ص:۶۔
۲۔ ایضاً، فروری ۱۹۸۵ء، ج ۱ ش ۹، ص:۴۔
۳۔ ایضاً، ص:۵۔
۴۔ ایضاً، ص:۵۔۶۔
۵۔ ایضاً، دسمبر ۱۹۸۳ع، جنوری ۱۹۸۴ء، ج ۱ ش ۷، ۸، ص:۷۔
۶۔ ایضاً، جولائی ۱۹۸۴ء، ج ۲ ش ۲، ص:۵۔۶۔
۷۔ ایضاً، جنوری ۱۹۸۵ء، ج ۲ ش ۸، ص:۴۔
۸۔ ایضاً، ستمبر ۱۹۸۹ء، ج ۷ ش ۴، ص:۴۔
۹۔ ایضاً، جون ۱۹۸۹ء، ج ۷ ش ۱، ص:۶۔
۱۰۔ ایضاً، دسمبر ۱۹۸۶ء، ج ۴ ش ۷، ص:۵۔
۱۱۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ج ۶ ش ۵، ص:۷۔
۱۲۔ ایضاً، اپریل ۱۹۸۷ء، ج ۱۱ ش ۴، ص:۴۔۵۔
۱۳۔ ایضاً، مارچ ۱۹۸۸ء، ج ۵ ش ۱۰، ص:۴۔
۱۴۔ ایضاً، اپریل ۱۹۸۹ء، ج ۶ ش ۱۱، ص:۵۔۶۔
۱۵۔ ایضاً، ''کیسے کیسے لوگ''، جون ۱۹۹۲ء، ج ۱۰ ش ۱، ص:۴۔
۱۶۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ج ۵ ش ۶، ص:۷۔
۱۷۔ ایضاً، جون ۱۹۸۹ء، ج ۷ ش ۱، ص:۵۔
۱۸۔ ایضاً۔
۱۹۔ ایضاً۔
۲۰۔ ایضاً، ''قدردانی عالمِ بالا معلوم شد'' دسمبر ۱۹۹۱ء، ج ۹ ش ۷، ص:۳۔
۲۱۔ ایضاً، ''ادبی خرکار''، اپریل ۱۹۹۳ء، ج ۱۰ ش ۱۱، ص:۳۔۴۔
۲۲۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ج ۷ ش ۵، ص:۶۔
۲۳۔ ایضاً، ''مسئلہ کیا ہے''، فروری ۱۹۹۲ء، ج ۹ ش ۹، ص:۳۔
۲۴۔ ایضاً، ''ہٹ یارٹ''، مئی ۱۹۹۱ء، ج ۸ ش ۱۲، ص:۳۔
۲۵۔ ایضاً، ''گدھوں کی تعداد میں اضافہ''، جولائی ۱۹۹۴ء، ج ۱۲ ش ۲، ص:۵۔
۲۶۔ ایضاً، ''کچھ عطائی طبیبوں کے باب میں''، اگست ۱۹۹۰ء، ج ۸ ش ۳، ص:۷۔
۲۷۔ ایضاً، جولائی ۱۹۹۰ء، ج ۸ ش ۲، ص:۴۔

(i) جامعہ کراچی، شعبہ اردو، کی ایک طالبہ سعدیہ قریشی نے شعبہ کی ایک استاد سہیلا فاروقی صاحبہ کی نگرانی میں سنہ ۲۰۰۷ء میں اس سوانح کو ایم اے اردو کے مقالے کے لیے مرتب کیا تھا مگر اس مرتبہ نسخے میں چند اقساط شامل نہیں ہیں اور کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

(ii) شومئی قسمت عقیل صاحب کے مرتبہ مطبوعہ نسخے میں بھی کل اقساط شامل نہیں ہیں۔

(iii) یہاں لیث صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پر طنز کیا ہے جن سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اپنی 'تاریخِ زبان و ادبِ اردو' کے صفحہ ۱۱۱ پر انھوں نے وحید قریشی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:
''سید صاحب (سید عبداللہ) کے ایک شاگرد ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔۔۔ان کی اصل شہرت ان کے دو کتابچوں 'شبلی اور عطیہ کی داستانِ معاشقہ' اور 'اقبال اور عطیہ کے خطوط' سے ہوئی ہے۔ وہ بھی فارسی کے استاد تھے اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی فارسی پر ہے۔ بعد میں انھوں نے میر حسن پر ایک کتاب لکھ کر ڈی لٹ حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع نہیں ہوا۔ نہ اس کا کوئی نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں دستیاب ہے۔ میر حسن کے صرف چند نسخے شائع ہوئے تھے اور وہ بھی اب نایاب، جو لوگ ان کو نقاد تسلیم کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ان کو دوسروں کی ٹوپی اچھالنے میں مزہ آتا ہے، یہی ان کی تنقیدی خصوصیت ہے۔

(iv) یہاں بھی روئے سخن ڈاکٹر وحید قریشی ہی کی طرف ہے۔

(v) اپنی 'تاریخِ زبان و ادبِ اردو' کے صفحہ ۷۰۰۔۷۰۱ پر لیث صاحب نے اطلاع دی ہے کہ یہ مضمون جو ''مصر کے لیڈر'' کے عنوان سے شائع ہوا، اقبال احمد سہیل نے لکھا تھا، جن کا ذکر رشید احمد صدیقی نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

(vi) اگرچہ 'ہجو' بھی قصیدے ہی کا ایک پہلو ہے لیکن اردو میں قصیدے سے 'مدح' مراد لی جاتی ہے۔ یہاں دراصل لیث صاحب نے سوداؔ کے جس قصیدے کا ذکر کیا ہے وہ ایک مثنوی بہ عنوان ''مثنوی در ہجو شیدی فولاد خان کوتوال شاہ جہاں آباد'' ہے۔ اس میں سوداؔ نے ایک رشوت خور کوتوال کا حال بیان کیا ہے جو چوروں سے رشوت لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے نوکر، خدمت گار تک چور اور اٹھائی گیرے ہیں۔ ایک دن اس نے طنزاً اپنے ان خادموں سے کہا کہ اگر تم میری کوئی چیز چُراؤ تو بازار میں اونے پونے بیچنے کی بجائے اس کی مقررہ قیمت مجھ ہی سے لے لینا۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ — کہا تم ہو مرے نپٹ دل خواہ
چیز میری جو اب چراؤ تم — چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم
قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو — اتنے کو تم اسے مجھی کو دو
ایک ان میں سے یہ سخن سن کر — لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر
کیا جب آپ تم نے یہ انصاف — میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف

آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے دو خریدار اس کے ہیں در پے
دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں

کلیاتِ سودا، جلداول، سنگِ میل، ۱۹۸۷ع،ص:۳۷۹

(vii) لیث صاحب کی ''تاریخ زبان وادبِ اردو'' ۱۹۹۸ء میں رہبر پبلشرز، کراچی نے تقریباً ۱۲۶۸صفحات کی ضخامت میں شائع کی۔ یہ کتاب بھی لیث صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح نایاب ہے۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

☆ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ۱۹۹۸ء، ''تاریخ زبان وادب اُردو''، رہبر پبلشرز، کراچی۔

☆ ماہ نامہ ''تہذیب'' شمارے: جون ۱۹۸۳ء، دسمبر ۱۹۸۳ء، جنوری ۱۹۸۴ء، جولائی ۱۹۸۴ء، جنوری ۱۹۸۵ء، فروری ۱۹۸۵ء، دسمبر ۱۹۸۶ء، اپریل ۱۹۸۷ء، مارچ ۱۹۸۸ء، اکتوبر ۱۹۸۸ء، اپریل ۱۹۸۹ء، جون ۱۹۸۹ء، ستمبر ۱۹۸۹ء، اکتوبر ۱۹۸۹ء، جولائی ۱۹۹۰ء، اگست ۱۹۹۰ء، مئی ۱۹۹۱ء، دسمبر ۱۹۹۱ء، فروری ۱۹۹۲ء، جون ۱۹۹۲ء، اپریل ۱۹۹۳ء، جولائی ۱۹۹۴ء،